بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلامی دستور اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کی پوری موجودہ تعمیر کو بدلنے چلے ہیں۔ گویا اب تعلیم، معیشت، تجارت، قانون، معاشرت، داخلہ و خارجہ پالیسی اور تمدن کے تمام شعبوں میں ہماری راہ سیکولرازم پر کاربند ہونے والی قوموں اور سلطنتوں سے الگ ہو رہی ہے۔ کہنا چاہیے کہ ہم ایک بڑا انقلابی موڑ مڑ رہے ہیں۔

اس طرح کے انقلابی موڑ سفرِ تاریخ میں جب بھی اقوام کے سامنے آتے ہیں تو حکمران طاقت کا پارٹ بڑا ہی اہم ہو جاتا ہے، کیونکہ وہی تمدن کی گاڑی کی ڈرائیور اور گارڈ ہوتی ہے۔ یہ طاقت اخلاص کے ساتھ اگر تبدیلی کے قلبی عزم کو پورا کرنے پر تل جائے تو دستور کا ایک ایک لفظ زندہ حقیقت بن جاتا ہے اور اگر یہی تبدیلی کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو دنیا کا بہترین دستور ردی کے ایک پرزے میں بدل جاتا ہے — یا اگر دستور کے پیچھے مضبوط اور منظم رائے عام موجود ہو تو پھر اس کے ساتھ سازگار نہ ہو سکنے والی قیادت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ طاقت تسلیم اللہ نہ کرے، اجتماعی پیمانے پر کسی تعمیری و اصلاحی مہم کا آغاز نہیں ہو سکتا۔

عام لوگوں میں امید، اعتماد، حرکت اور سرگرمی کا آغاز اسی دن ہو گا جس دن وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے رہنما اور لیڈر اور ان کے حکمران اور کارپرداز بدل رہے ہیں۔ ان کو محسوس ہونا چاہیے کہ یہ لوگ جو نیا دستور لائے ہیں وہ محض ایک "کھوکھلی" کاغذی کارروائی" نہیں ہے، بلکہ اس کے بنانے اور پیش کرنے اور اسے نافذ کرنے والوں کے اندر نیک نیتی کارفرما ہے، نئے جذبات برسرِ عمل ہیں، پہلے سے مختلف ذہنیت پیدا ہو چکی ہے اور ایک الگ قسم کا کردار ارتقاء کر رہا ہے۔ اب ان لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل گئے ہیں، اب ان کے فیصلوں کے معیارات نئی شکل اختیار کر گئے ہیں، اب ان کی پالیسیوں کا رُخ دوسرا ہے، اب انہوں نے بھلائی اور برائی کے دوسرے پیمانے لے لیے ہیں، اب ان کے تعاون اور تصادم کے وجوہ پہلے سے مختلف

ہو گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ لوگوں کو اپنے کار پردازوں کے متعلق یہ تاثر ملنا چاہیے کہ اب یہ لوگ ویسے نہیں رہے جیسے پہلے ہوا کرتے تھے، اب یہ نئی شان سے جلوہ گر ہوئے ہیں اور اب ان کے ساتھ نئے طرز سے معاملہ کرنا چاہیے۔

اگر کسی اہم تاریخی موڑ کے آنے پر حکمران طاقت اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کر کے عوام کو یہ تاثر دیتی ہے تو لوگوں میں ایک نیا جذبۂ اعتماد پیدا ہوتا ہے، ان کی امیدوں میں جان پڑ جاتی ہے، ان میں فداکاری و اطاعت کا میلان زور پکڑتا ہے اور وہ قربانیاں دینے اور کچھ کر دکھانے کی نئی اسپرٹ کے ساتھ متحرک ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو پھر محض کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کا جادو کسی قوم کو نئی زندگی نہیں دے سکتا اور نہ عوام کو مایوسی اور بے اعتمادی کی حالت سے نکال سکتا ہے۔

پس نئے دستور کے نفاذ سے قبل حکمران طاقت کو چاہیے کہ وہ اپنے ذہن اور مزاج اور کردار کو یکسر بدل کر نئے روپ میں قوم کے سامنے آئے۔

حکمرانوں کے بارے میں عوام اب تک جو تصور رکھتے ہیں اس کے بُرے اثرات ہر پہلو سے نمایاں ہیں۔ جب تک یہی تصور قائم ہے، یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنے لیڈروں سے حقیقی محبت ہو، وہ ان پر دلی اعتماد رکھیں، وہ ان کے اشاروں پر متحرک ہوں، وہ سچے وفادارانہ جذبات سے ان کے احکام کی اطاعت کریں اور ان کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے قربانیاں دیں۔ اس تصور کے ہوتے ہوئے تو بس یہی ممکن ہے کہ جہاں تک قانون و اختیار کا ڈنڈا چل سکے وہاں تک کارواں رہبروں کی مرضیات کی تعمیل کرے اور جہاں اس ڈنڈے کی پہنچ نہ ہو یا اس کی مار سے بچنے کے لیے کوئی ڈھال بہم پہنچائی جاسکے وہاں جو جس کا جی چاہے کرتا ہے۔

اب تک ملت اپنے سربراہ کاروں کا تصور یہ رکھتی ہے کہ یہ عام لوگوں سے الگ تھلگ ایک مخلوق ہیں جس کی ایک الگ دنیا ہے۔ یہ لوگ عام لوگوں کے بھائی بند نہیں ہیں بلکہ خصوصی حقوق رکھنے والے دیوتا ہیں۔ یہ گویا سیاسی برہمنوں کا ایک فوق العام طبقہ ہوتا ہے۔ یہ قوم کے خادم نہیں، اس کے آقا و مولا

ہیں۔ ان کا رہن سہن ایک "عالم بالا" میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگیوں کا مشن اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ عہدوں کے لیے کشمکش میں لگے رہیں اور اس کرسی سے اچھل کر اس کرسی پر اور اس مسند سے چھلانگ لگا کر اس مسند پر آتے جاتے رہیں۔ ہر حال میں ان کو قومی خزانے سے بڑی بڑی تنخواہیں ملنی چاہئیں، جن کے بل پر بڑی بڑی جائدادیں بنائی جاسکیں اور غیر ملکی بنکوں میں آئندہ سات پشتوں کے لیے سرمائے جمع ہو جائیں، رہنے کو اعلیٰ درجہ کی آراستہ کوٹھیاں اور پر فضا بنگلے ہوں، تفریح کے لیے ٹھاٹھ دار بالمقاعد ہوں، آنے جانے کے لیے اسپشل ٹرینیں، بھاری بھرکم اور نازک خرام کاریں اور صبار فتار ہوائی جہاز ہوں، شاہانہ جلوس نکلوانے کے لیے کئی کئی گھوڑوں سے کھینچی جانے والی زرق برق بگھیاں ہوں، خدمت کے لیے نوکروں کے پرے ہوں، اٹھنے بیٹھنے کے لیے شاہانہ فرنیچر ہو، ہر ہر ضرورت کے لیے بڑے بڑے الاؤنس ہوں، دعوتوں اور ضیافتوں کے لیے مرعوب کن شاہانہ سامان ہوں، جدھر جائیں "تاریخی استقبال" اور سلامیوں کے انتظامات سرکاری اثر و دباؤ سے کرائے جائیں، جن راستوں سے ان کا گزر ہو، خدا کی دوسری مخلوق کے لیے ان پر قدغن لگا دی جائے اور ان کی تفریحات کے لیے اسراف کی آخری حدوں کو چھو لیا جائے۔ ان حالات میں دیکھا جائے تو حکومت کے اونچے عہدے بڑی سے بڑی جاگیرداری اور زمینداری اور بڑی سے بڑی تجارت اور کرخنداری سے زیادہ نفع آور ہیں۔ ایسا شاندار کاروبار اور کونسا ہو گا۔ کیسے یہ ممکن ہے کہ کارِ حکمرانی ذاتی مفاد کی چاٹ سے پاک رہ سکے۔

اور عام لوگ حکمرانوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہم سے جو ٹیکس اور مالیہ و آبیانہ اور دوسرے محصولات و واجبات ریاست کے نام سے سرکاری خزانے میں لیے جاتے ہیں، یہ سب انہی کا استعمال ہے۔ پھر جب وہ اپنی بدحالیوں اور پریشانیوں سے گزرتے ہوئے ان مناظر کو دیکھتے ہیں تو ان کے حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ان حالات کو جوں کا توں رکھ کر اب اگر اسلام کی بولی بولی جائیگی تو آخر اس بولی کی ساکھ بھی کیا باقی رہے گی۔

ناگزیر ہے کہ ملت کے سربراہ کار اپنے طرزِ عمل کی تبدیلی سے اپنے بارے میں ایک نیا تصور دلائیں۔ وہ قومی خزانے کے لیے ایک نیا رحمدلانہ رویّہ اختیار کریں اور محسوس کرائیں کہ یہ "خدمت" کوئی کاروبار نہیں ہے، یہ ذاتی مفاد کا کوئی کھیل نہیں ہے اور اس سے ان کا مقصود اپنے لیے سامانِ عشرت اور اپنے بچوں کے لیے

جائدادیں پیدا کرنا نہیں ہے۔ نیز وہ پہلے سے اندازِ سنگبار اور شانِ جلالت مآبی کو چھوڑ کر ملک کے شہریوں کو یہ تاثر دلائیں کہ وہ ان کے بھائی ہیں، ان کے ساتھی ہیں، ان کے خادم ہیں ——— اس سے زائد کچھ نہیں ہیں۔

عہدے کی کرسی کے متعلق عام لوگوں کا مستقل تصور یہ ہے کہ اس پر بیٹھنے والا اپنے لیے، اپنے بچوں اور عزیزوں کے لیے، خاندان اور برادری والوں کے لیے، کشمکشِ اقتدار میں ساتھ دینے والے حامیوں کے لیے جدھر چاہے کامیابی اور ترقی کے دروازے کھول سکتا ہے۔ وہ نوکریاں دلوا اور چھنوا سکتا ہے، وہ ٹھیکے اور کوٹے حاصل کرنے میں مدد بھی دے سکتا ہے، مزاحمتیں بھی پیدا کر سکتا ہے، وہ مکان، زمین، دکان اور کارخانے کی الاٹ منٹ کرا کے دے بھی سکتا ہے اور پہلے کی الاٹ منٹ کو منسوخ کرا بھی سکتا ہے، وہ مقدمے چلوا بھی سکتا ہے اور چلتے مقدمے کو رکوا بھی سکتا ہے، وہ تھانے میں ایک ٹیلیفون کر کے تفتیشی کارروائی کا رُخ بدلوا سکتا ہے، وہ ضیافتوں اور کلب کی مجلسوں میں کسی عہدہ دار کو دو لفظی اشارہ دیکر بگڑے کام بنوا سکتا ہے اور بنے کام بگاڑ سکتا ہے۔ اور وہ کسی فہرستِ استحقاق کی ترتیب کو توڑ کر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرا سکتا ہے۔ قانون اس کا بندۂ بے دام، پالیسی اس کے گھر کی لونڈی اور ضابطہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا ہوتا ہے۔ عہدے کے تصرفاتِ ظاہری و باطنی کی ان ساری شکلوں کے کرشمے دنیا ہر صبح اور ہر شام اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ یہ سب کے سامنے سفارش کی کنجی سے قفل کھلتے ہیں، اثر و رسوخ جب کسی دروازے پر کھڑے ہو کر کہتا ہے "کھل جا سم سم!" تو معاً اس کے کواڑ چوپٹ کھل جاتے ہیں، اہلِ جاہ اپنی انگشتِ اختیار کی انگوٹھی کو رگڑتے ہیں تو انتظامی طاقت کا جن اپنی پوری شانِ تصرف کے ساتھ دست بستہ حاضر ہو جاتا ہے۔ یہی رنگ ڈھنگ ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر ہر آدمی کی رال ٹپکتی ہے کہ اسے یا اس کے بال بچوں اور برادری کے لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو گورنر، وزیر، ایم ایل اے، سیکرٹری، کمشنر، مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ پولیس، انکم ٹیکس آفیسر یا کچھ نہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ ہر خاندان اس کا آرزومند ہے کہ کامیابی کے تالے کھولنے والی بڑی یا چھوٹی، ایک نہ ایک کنجی اس کے ہاتھ میں بھی ہونی چاہیے۔

عہدہ و اختیار کے اس طریقِ استعمال نے ایک طرف تو قانون، ضابطے، دفتری نظام اور سرکاری پالیسیوں کا سرے سے احترام ختم کر دیا ہے اور لوگوں کو رضاکارانہ جذبات کے ساتھ اطاعت اور تعاون کرنے کے قابل

نہیں چھوڑا، نیز بد دیانتی کا زہر سارے نظم و نسق کی رگوں میں پھیلا دیا ہے، دوسری طرف عام لوگوں میں یہ تصور راسخ کر دیا ہے کہ کارِ حکمرانی اپنی اور اپنے دوستوں عزیزوں کی دنیا بنانے کا ایک کھیل ہے۔ اسی مقصد سے ایک ایک حریصِ اقتدار ہر قسم کی دھاندلی کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ طرح طرح کی سانٹھ گانٹھ کر کے کسی کرسی سے عمر بھر کے لیے چمٹا رہنا چاہتا ہے۔ انتخابات میں قانون، اخلاق اور جمہوریت کی اقدار کی مٹی جس طرح پلید کی جاتی ہے اور پھر ایوانِ اقتدار کے اندر جو دھڑے بندیاں بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں وہ بجائے خود اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ریاست اور قوم اور عوام کا نام ہے کہ در اصل نفسانیت اپنے کرشمے دکھا رہی ہے۔

یہی نفسانیت اگر سنہرے حروف میں لکھا ہوا اسلامی دستور گلے میں ٹکا کر میدان میں نکلے اور اس بات کی امیدوار ہو کہ اب لوگ اس کا خیر مقدم احترام کے جذبوں سے کریں۔ اور دیدہ و دل فرشِ راہ بنائیں اور اس کے ایک ایک اشارے پر قربانیاں دیں اور اپنی زندگیوں کا نقشہ بدل ڈالیں تو یہ توقع عبث ہو گی۔ ایسی ڈرامائی حرکت سے موجودہ ماحول کے کسی گوشے میں رتی بھر تبدیلی بھی رونما نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی رونما ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ ہمارے حکمران اس نفسانیت کو طلاق دیں اور اخلاص کا نیا رنگ اپنے کردار کے نقشے میں بھر کر پبلک کے سامنے آئیں۔ وہ اسلامی دستور کے دور کا پہلا سورج طلوع ہونے کے ساتھ اگر ایک نیا طرزِ عمل لے کر اٹھیں تو پھر یقیناً پوری قوم جواباً ایک نیا طرزِ عمل پیش کرے گی۔ ان کو یہ تبدیلی پہلے دن ہی سے محسوس کرا دینی چاہیے کہ اب اس ملک کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم سے لے کر تمام بڑے چھوٹے عہدہ داروں تک کوئی بھی عہدہ و اختیارات کی طاقت سے اپنے حریفوں کو زک دینے اور اپنے اور اپنے دوستوں عزیزوں کے کام سنوارنے کی خیانت کرنے والا نہیں رہا۔ اب سے پبلک کا کوئی خادم قانون اور ضابطہ اور پالیسی سے بالاتر ہو کر ناجائز تصرفات نہیں کرے گا۔ اسلامی دستور کے پاس ہوتے ہی پہلے لمحے ملت کے کارپردازوں کو یہ نیا تاثر دلانا چاہیے کہ حکومت و اقتدار اپنی دنیا بنانے کا ایک کھیل نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم بلکہ ساری انسانیت کی سب سے بڑی، سب سے نازک اور سب سے مشکل خدمت ہے۔

اخلاص مندی کے ساتھ اپنے رویّے کی تبدیلی سے یہ تاثر دلا کر دیکھیے کہ اس کا ردِّ عمل کیسا حیرت انگیز ہوتا ہے۔

حکمرانوں کے بارے میں ــــ اکا دکّا افراد کے استثنا کے ساتھ سہی ــــ جمہور کا ایک تصور یہ بھی چلا آرہا ہے کہ یہ لوگ دستور کو اسلام کا جو تھوڑا بہت رنگ دے رہے ہیں اس کے پیچھے قلب و نظر کی حقیقی تبدیلی کار فرما نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ چار و ناچار کیا جا رہا ہے۔ لوگوں کی اس بدگمانی کو تین اسباب نے پیدا کیا اور مسلسل پالا پوسا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر کئی کئی بار اسلام کے ایک ایک تقاضے کی مزاحمت کی جاتی رہی ہے۔ اور اس کشمکش میں استدلال، کٹ حجتی اور استہزا کے سارے ہی ہتھیار استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ بات بات پر ملّا ازم کے طعنے، ہر ہر مرحلے میں مذہب کو گروہی سیاست کے لیے ناجائز طور پر آلۂ کار بنانے کا الزام اور ساتھ ہی دین و سیاست کو الگ کر دینے کے عزم کا اظہار، اور پھر ایک لاینحل ذہنی انتشار کے مظاہرے، ایسی چیزیں ہیں کہ جنھوں نے عام مسلمانوں کو عجیب الجھن اور دبدا میں ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں بدگمانی پیدا کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام کو جاننے سمجھنے، اس سے وفاداری رکھنے، اس پر عملاً کاربند رہنے اور اسے ایک نظام کی حیثیت سے عالمِ واقع میں نصب کرنے کی جد و جہد کرنے والے عناصر کے ساتھ حکمران طاقت کا معاملہ پچھلے چند برس سے نہایت درجہ حریفانہ و سخت گیرانہ رہا ہے اور ابھی تک اس پہلو سے اس کی پالیسی میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہوا۔

ان اسباب کو اصل تقویت جس چیز نے پہنچائی ہے وہ ملّت کے کارپردازوں کی سوشل سرگرمیاں اور کلچرل دلچسپیاں ہیں۔ جن سے ان کی خود اپنی زندگی کا ایک خاص مزاج ٹپکتا ہے اور جن سے وہ رُخ متعین ہوتا ہے جس پر وہ اپنی پوری قوم کو لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ مخلوط مجالس عام ہو رہی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ بیگمات کلچر کے ڈرامے میں کیا پارٹ ادا کر رہی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ شرابیں پی جاتی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ ناچ ہوتے ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ نہایت درجہ سفلہ فیشنوں کے فروغ کے لیے فاخرہ لباسوں کی نمائشیں لگتی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ نسائیت کی فطرت کو بدلنے کے لیے مینا بازار منعقد ہوتے ہیں،

لوگ دیکھتے ہیں کہ گھٹیا درجے کی گندی موسیقی کی سرپرستی و حوصلہ افزائی ہوتی ہے، لوگ دیکھتے ہیں کہ آرٹ کے خوشنما نام پر کسی عریانی آموز مصوری اور کسی نفسانیت افروز بت گری کی ترویج کی جارہی ہے، لوگ دیکھتے ہیں کہ فحش مناظر سے بھرے فلموں کے افتتاح ہوتے ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ درسگاہوں تک کے ذریعے ان کی اولادوں کو اسی رنگین کلچر کی تربیت دی جارہی ہے اور دیہات تک اس کی وبا پھیلانے کے لیے منظم سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے والے یہ سوچے بغیر بھی نہیں رہتے کہ انہی کی کمائیوں سے نچوڑے ہوئے روپے کے بل پر یہ رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔

اسلام کو آپ کتنا بھی متحرک قرار دیں اور اس کا کتنا ہی بڑا ترقی پسندانہ تصور ذہن میں قائم کریں، اس غیر ملکی کلچر کی کھپت اس کے ڈھانچے میں کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ آپ اجتہاد کا وسیع سے وسیع گیٹ بھی کھول لیں تو بھی، صریح حرام اور مکروہ چیزوں کو حلال نہیں بنایا جا سکتا اور گناہ کو ثواب میں نہیں بدلا جا سکتا۔

اب اگر ایک دستور میں آپ یہ لکھ لائیں کہ ہم مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالیں گے اور شراب، رقص، قمار اور دوسرے مفاسد کی بندش کر کے ایک صالح ماحول پیدا کریں گے لیکن اس کے ساتھ خود اپنی زندگی کو ان مفاسد سے جوں کا توں آراستہ کیے ہوئے ہوں تو کروڑوں انسانوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ کیسے باور کرائیں گے کہ یہ آپ کے مخلصانہ عزائم ہیں اور خود آپ ہی سب سے بڑھ کر ان عزائم کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

کم سے کم وہ چیزیں جو صریحاً حرام ہیں اور جن کے بارے میں ایک نظر میں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نمونے کے عظیم ترین انسان — محمد صلی اللہ علیہ وسلم — کی زندگی کے خاکے میں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں، نہ مدینہ کی نمونے کی ریاست اور سوسائٹی کا مزاج ان کو اپنے تصور میں جگہ دے سکتا ہے، ان کو اسلامی دستور کا جھنڈا اٹھا کر چلنے سے قبل ہی حکمران حضرات یک قلم ترک کر دیں۔ دوسری طرف اسلام کے وہ اساسی تقاضے جن میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، ان کو اس طرح نئے جذبہ و ذوق کے ساتھ اختیار کریں جیسے ایک نو مسلم اختیار کرتا ہے۔

سالہا سال کے بنے ہوئے ذوق اور عمر بھر کی رچی بسی عادات کے بندھن توڑ کر نئے راستے پر چل کھڑے ہونا آسان کام نہیں، لیکن قوموں کی رہنمائی و قیادت کرنے والوں کی ذمہ داریاں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ان کی خاطر وہ

بڑی بڑی مشکلوں کو عزم صمیم سے حل کیے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو پاکستان کے ساڑھے سات کروڑ باشندوں کی اجتماعی زندگی کو بدلنے کا درپیش ہے جو اس سے بہت زیادہ بڑا ہے، اور اس بڑے کام کو اگر کرنا ہے تو اس کے مقابلے میں چند افراد کی زندگیوں کا بدلنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جو شخص اور جو گروہ اپنے آپ کو اس تحول سے گذار لے جائے گا وہ ماتحت کارکنوں اور عام لوگوں کی نگاہ میں ایک نئی قدر و قیمت حاصل کر لیگا۔ اس کے اندر کردار کی ایک نئی قوت ابھر آئیگی جو اس کے ایک ایک بول میں نیا وزن پیدا کر دیگی۔ وہی نئے دستور کا قافلہ سالار ہوگا۔ وہ پکاریگا تو دنیا لبیک کہے گی، وہ حرکت کریگا تو اس کے ساتھ پورا کارواں متحرک ہوگا، وہ جدھر مڑیگا تاریخ بھی اسی طرف رخ کریگی۔

قول و عمل کا تضاد ہمیشہ زندگی میں فساد پیدا کرتا ہے، اس سے صلاح کی امید نہیں باندھی جا سکتی۔ تضاد کشمکش کا موجب ہو سکتا ہے، یک جہتی اور تعاون کا وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ تضاد مایوسی اور جمود پیدا کرتا ہے، اس کے ذریعے امید اور حرکت نہیں پیدا ہوتی۔

حکمران جماعت کے بارے میں ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اختلاف اور تنقید کو گوارا کرنے کے لحاظ سے سخت "تنگ نظر" ہوتی ہے۔ جو لوگ "قیادت" کی مسندوں پر جا بیٹھتے ہیں وہ بہر حال کوس انا ولا غیری بجانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی آواز بلند ہو تو بس ان کے مداحوں اور قصیدہ خوانوں اور جی حضوریوں کی ہو۔ یہ نقار خانہ ایسی ہی آوازوں سے گونجتا رہے اور اگر کوئی اور بولی بولی جائے تو وہ بس طوطی کی صدا بن کر رہ جانی چاہیے۔ لیکن اگر کسی طوطی کی آواز نقار خانے میں سنی جانے لگے تو ناگزیر ہے کہ وہ گردن زدنی ٹھہرے۔ کوئی شخصیت اور کوئی جماعت اگر ارباب اقتدار سے مختلف نظریات اور پروگرام کے علمبردار ہو تو پہلے ہی دن سے اس کا وجود آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے، اور اگر وہ عوام میں مقبولیت بھی حاصل کرے تو پھر خطرناک ہو جاتی ہے اور اگر وہ اتنا زور پکڑتی نظر آئی کہ حالات کی رو کو دیر سویر متاثر کرنے کے قابل ہو جاتے گی تو پھر باغی اور غدار ہونے کا سرٹیفکیٹ پالیتی ہے۔ محکمۂ سنسر اپنا ایک مستقل عملہ اس کام میں لگا دے گا کہ ہر ہر شہر کے ڈاک خانوں میں بیٹھا وہ خداوندان نعمت سے اختلاف کرنے والوں کی دفتری اور

نجی ڈاک کا خورد بینی تجزیہ کرتا رہے۔ سی آئی ڈی پلٹنیں کی پلٹنیں اس مہم میں لگا دے گی کہ وہ ان مشتبہ لوگوں کی نقل و حرکت کو بھیس بدل بدل کر کمین گاہوں سے تاکا کریں، نوٹ کریں کہ وہ کہاں جا کر کس کس سے ملے، ان کی کونسلوں اور مجالس اور جلسہ ہائے عام میں کیا کارروائیاں ہوئیں اور ان کی کن سرگرمیوں کا پس منظر کیا ہے چنانچہ سرکاری خزانے کے صرف سے ایک ایک فرد کے نام کا فائل کھل جاتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ ایک لمبے چوڑے دفتر بے معنی کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس دفتر کا مصرف بس یہ ہوتا ہے کہ جب اختلاف کرنے والی کسی طاقت کی عوامی مقبولیت کے بڑھنے کا، یا اس کی کسی مہم کے مؤثر اور کامیاب ہو جانے کا، یا انتخابات میں اس کی طرف سے کسی نامطلوب پارٹ کے ادا ہونے کا خطرہ سامنے آجاتا ہے تو اوپر سے اس پراسرار نظام کو اشارہ ملتا ہے کہ فلاں کے خلاف کچھ مواد نکال کے لاؤ۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ فاسد مواد ان دفاتر میں سے چھان پھٹک کر نکال لیا جاتا ہے اور پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر تو وہ بالکل ہی سرسری اور ہوائی نوعیت کا ہوتا ہے تو کوئی سرکاری ترجمان اٹھتا ہے اور ایک اچھی بھلی جانی بوجھی قابل اعتماد شخصیت اور ملک و قوم سے محبت رکھنے والی جماعت کے بارے میں کوئی سنسنی خیز انکشاف کر دیتا ہے۔ اس انکشاف کے بعد پھر بعض ماہرین فن اخبار نویس مخالفانہ پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں۔ یہ چند روز تک فضا میں خوب اچھی طرح ہل چل مچائے رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ زور پیدا کرنا ہو تو سرکاری ترجمان کے بجائے ملک کے کوئی ذمہ دار عہدہ دار یا کوئی وزیر صاحب خود اپنی زبان سے کسی غیرملکی سے ملنے اور کسی خفیہ سازش کی خبر قوم کو سنائیں گے۔ اور اگر وہ مواد ایسا ہو کہ کسی استبدادی قانون کی زد پر لایا جا سکے تو پھر اسے قانونی مشیروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور ان سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے کہ قانون کے اسلحہ خانہ کا جائزہ لے کر بتاؤ کہ کونسا کاری تیر ایسا ہو سکتا ہے جو اس معاملے میں حریف کا سینہ چھید جائے۔ اس مقصد کے لیے نت نئے ناوک ہائے ہدف گیر تیار کیے جاتے رہتے ہیں اور اب ہمارے قانونی اسلحہ خانے اس ضرورت کے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہیں کہ کسی بھی شخص یا گروہ کے کسی بھی قول یا فعل کو وجہ گرفت بنایا جا سکے۔ افراد کو شکار کرنا ہو تو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ موجود ہے، اخبار کو شکنجے میں کسنا ہو تو اسی زریں قانون انضباط کی دفعہ ۲۱ حاضر ہے، اس سے زیادہ مظاہرۂ انصاف کرنا ہو تو پھر پریس ایمرجنسی ایکٹ موجود ہے۔ کسی جماعت کے شعبۂ

نشر و اشاعت کا راستہ روکنا ہو تو اس کی دفعہ ۸ اٹری کا گر ہے، ان میں کچھ کوتاہی ہو تو بنگال کرائمز ریگولیشن اور فرنٹیر کرائمز ریگولیشن کے بھرے پُرے ترکش مہیا ہیں، کوئی بھی قانون کارگر نہ ہوتا ہو تو نہ سہی، بار بار مقدمات بنا بنا کر اختلاف کے مجرموں کو پریشان کیا جاسکتا ہے اور ان کی قوتوں اور مال اور وقت کو برباد کرایا جاسکتا ہے مجموعی طور پر سیاسی سرگرمیوں کو معطل کرنا ہو اور سرے سے پبلک کی آواز کو دبانا ہو تو دفعہ ۱۴۴ اٹبری مجرب طاقت ہے، جس کے نفاذ کی مدت ختم ہونے پر مسلسل تجدید کرتے چلے جائیے، اس دفعہ کا بہت ہی معصومانہ استعمال یہ ہے کہ اسے مجرد لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی حد تک عائد کیجیے اور کہیے کہ دیکھیے ہم نے تقریروں اور جلسوں کے حقوق کو ذرا نہیں چھیڑا، زیادہ بھرپور مار کرنا ہو تو ۹۲ الف کے دور دورہ کا اعلان کر دیجیے تاکہ اسمبلی کے ایوان پر بھی تالے پڑ جائیں، اور آگے جانا پڑے تو مارشل لا لگا دیجیے۔

عالم یہ ہو گیا ہے کہ اس ملک میں وفاداری ان لوگوں کا اجارہ ٹھہری ہے جو کسی کرسی پر تشریف فرما ہوں اور جو لوگ کرسی پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ فرش خاکی پر چل پھر رہے ہوں وہ سب کے سب اس صورت میں غدار ہوتے ہیں جبکہ ان کے نظریات، آراء اور لائحہ ہائے عمل حکمران بزرگوں سے اختلاف رکھنے والے ہوں۔ حد یہ کہ کل تک جو جو کوئی کرسی تک رسائی نہ رکھنے کی وجہ سے خود غدار کہلاتا تھا، وہ آج کرسی پا لیتے ہی وفا کا پتلا بن کر دوسروں پر غداری کا ٹھپہ لگانے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی سیاسی تکفیر کی فتوی بازی ہے جو روایتی مفتیوں اور فقیہوں کی شان سے مشغلۂ عام بنی ہوئی ہے۔ اب کوئی نہیں رہا جس پر سیاسی مفتیوں نے ایک نہ ایک بار کفر کا فتوی چپک نہ چھوڑا ہو۔ پہلے پہل صرف کمیونسٹ غدار کہلاتے تھے۔ یا پھر یہ فتوی سابق کانگرسیوں پر لگایا جاتا تھا، بعد میں آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"۔ خاکسار غدار ٹھہرے، خدائی خدمتگار پاکستان دشمن شمار ہوئے، آزاد پاکستان پارٹی والے روس کے ایجنٹ گنے گئے، احراری مخالف ریاست اور غیر امن پسندانہ سرگرمیوں کے ملزم گردانے گئے، تحفظِ ختم نبوت والے قانون شکن اقدامات کے مجرم شمار ہوئے، ناظم الدین اور دولتانہ اور ان کی وزارتیں ملکی مفاد سے بے نیازی کی قصوروار بنیں، سابق دستوریہ بہ حیثیت مجموعی سازشوں اور جوڑ توڑ کے کوڑھ کی مریض سمجھی گئی، پھر میاں افتخار الدین سے لے کر میر غلام علی تالپور تک، قیوم خاں سے لے کر سردار عبدالرشید تک اور مولوی فضل الحق صاحب

سے لے کر سہروردی اور بھاشانی تک ایک ایک کر کے ہر نمایاں آدمی کے ماتھے پر غداری کی مہر لگتی رہی۔

اور — جماعت اسلامی؟ — اس کا نام تو روزِ اوّل سے غداروں اور ملک دشمنوں میں سرِ فہرست درج ہوا۔ کبھی اسے انڈیا سے روپیہ دلوایا گیا، کبھی روس سے آتے ہوئے روبلوں کے توڑے اس کے حساب میں لکھے گئے اور کبھی امریکہ کے ڈالروں کی تھیلیاں اس کے کھاتے میں درج کی گئیں۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے صحافیوں نے جماعت اسلامی کا جوڑ ایران کے فدائیانِ اسلام سے لگایا، کبھی مشرقِ وسطیٰ کے اخوان سے اور کبھی انڈونیشیا کی دارالاسلام پارٹی سے! — جب جس گروہ کے خلاف مغربی طاقتوں نے بدنام کن پروپیگنڈہ کی فضا پیدا کر دی، بس اسی کے ساتھ جماعت اسلامی کا خفیہ رابطہ قائم کر دکھایا گیا۔ بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں نے — پرائیویٹ مجالس ہی نہیں، جلسوں کے پلیٹ فارموں اور قومی پارلیمنٹ کے ایوانوں سے — اس کے بارے میں طرح طرح کے غیر ذمہ دارانہ انکشافات کیے۔ چنانچہ اس درجہ کی "مشتبہ" جماعت کو ہر غیر معمولی ہنگامے کی لپیٹ میں لینے کا دروازہ کھلا رہا اور اس دروازے سے ہر طرح کے حوادث اس پر حملہ آور ہوتے رہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اگر ہم لوگ اپنے اعزہ و احباب کو خطوط میں نجی امور بھی لکھیں، مکتبے اور اخبار کے دفتر سے کاروباری خط و کتابت بھی کریں اور سرکاری طور پر سرِ عام شائع ہونے والے عام لٹریچر یا اخباروں میں آئی ہوئی کھلی معلومات — جو معمولاً تمام اخبارات کے ذریعے باہر جاتی رہتی ہیں — کسی خبری مراسلے میں لکھ بھیجیں، بلکہ اگر یہاں کی منڈیوں کے نرخ کا ہی کوئی تذکرہ کر بیٹھیں اور یہاں کے کسی جلسۂ عام کی کوئی تصویر جو عام اخباروں میں آ گئی ہو کہیں روانہ کر دیں، تو ہر وقت اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مہربان کوٹھے پر چڑھ کر دنیا کو ایک غیر ملکی سازباز کی خبر نہ سنا دیں اور ہمارے خلاف کوئی نہ کوئی سخت گیرانہ اقدام قانون یا استبداد کے دائرے میں نہ کر بیٹھیں۔ سوچیے کہ مولانا مودودی تک کی شخصیت مشکوک ٹھہرا دی گئی ہے — تا بہ دیگراں چہ رسد!

یہ فارمولا کہ جو آپ سے اختلاف کرے وہ لازماً غدار ہے، دوسروں سے بڑھ کر خود آپ کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہے اور اس نے خود آپ ہی کی ساکھ کو گرایا ہے۔ لوگوں کا عام تاثر یہی ہے کہ اقتدار کو دوامی جاگیر بنا رکھنے کا ایک رجحان ہے جس کی وجہ سے یہ بزرگ ہر اس طاقت کو غداری کے لقب سے

(باقی ص ۶۹ پر)